Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:5 (1966)

اسلام کی معاشی تعلیمات

اور ہمارا جدید معاشرہ

(محمد مظہر الدین صدیقی - ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی)

عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال پختہ طور سے جما ہوا ہے کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز لازماً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یورپ، امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک سے جو خیالات و نظریات ہمارے ملک میں در آئے ہیں، وہ سب کے سب غیر اسلامی اور مسترد کر دینے کے قابل ہیں۔ جمہوریت اس لئے قابلِ قبول نہیں کہ وہ ایک مغربی طرزِ حکومت ہے۔ سوشلزم اس وجہ سے اسلام کے منافی ہے کہ اس کا خیال پہلے پہل یورپ کے ملکوں میں پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے ہمیں بیرونی نظریات اور اداروں سے یکسر بے نیاز رہنا چاہیئے۔ یہ دعویٰ اگرچہ فی نفسہٖ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ سے ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اصولی اور مقصدی تعلیمات سے قطع نظر جزئیات، تفصیلات اور عملی تدابیر کے معاملہ میں بھی ہمیں دنیا سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے۔ حالانکہ اسلام نے اپنے اصول و مقاصد متعین کر دینے کے بعد عملی تفصیلات کی حد تک ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم ان کو زمانہ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق طے کریں۔ درحقیقت اس طرزِ خیال کے پسِ پشت دو مفروضات ہیں جو دونوں کے دونوں غلط ہیں۔ پہلا مفروضہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانانِ پاکستان عالمی قوتوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر ایک تہذیبی خلاء میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نیز قوموں اور تہذیبوں کے درمیان اثر و تاثیر اور فعل و انفعال کا جو عمل تاریخ میں ہمیشہ سے جاری رہا ہے یا تو وہ محض ایک وہم باطل ہے یا اس کا سلسلہ اب بالکل مسدود ہو گیا ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ اسی تاریخی عمل کے تحت ہم نے مغرب سے بے شمار چیزیں لے کر اپنائی ہیں۔ مغرب کے اثرات

اور عالمی تہذیب کے دباؤ ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے موجودہ نظامِ صنعت اختیار کر کے بڑے بڑے کارخانے قائم کیئے اور مواصلات کو ترقی دی۔ انھیں اثرات کے نتیجہ میں ہمارا دفتری نظم و نسق مغربی انداز پر چل رہا ہے۔ ہم کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں مغربی علوم پڑھا رہے ہیں اور مغربی سائنس کے تمام علمی۔ نظری اور عملی طریقوں کو اخذ کر رہے ہیں۔ ہم نے گذشتہ چند سالوں میں مغربی طب سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ ہمارے اسپتال اور دواخانے مغربی اسپتالوں کے نمونہ پر قائم ہیں۔ اس کے باوجود تہذیبی اور فکری میدان میں ہمارے بعض افراد و طبقات کو مغرب سے بیر ہے۔ اس کی توجیہہ میں بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ہم مغرب سے اس کے عملی اور سائنسی طریقے (TECHNIQUES) تو مستعار لیں گے لیکن مغربی افکار و نظریات سے اپنا دامن محفوظ رکھیں گے حالاں کہ سائنس کے عملی طریقوں کی بنیاد اس کے علمی نظریات پر ہے۔ نظریہ اور عمل کو اگر کسی اور شعبہ میں جدا نہیں کیا جا سکتا تو سائنس کے شعبہ میں کیسے جدا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے مغرب کے سائنسی افکار اور علمی نظریات سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں جتنا ہمارے بعض طبقات سمجھتے ہیں۔ اصل میں صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم مغرب کے افکار و نظریات کو مسترد کر کے ایک ذہنی خلا میں زندگی بسر کریں بلکہ ہمیں ان جدید نظریات کو اپنی موروثی فکر کے ساتھ ترکیب دینا چاہیئے۔ پھر اس ترکیب 'INTEGRTION' سے جو نئی فکر پیدا ہوگی وہی حقیقی اسلامی فکر ہوگی۔ ہماری موجودہ فکر تمام تر اسلامی نہیں بلکہ بہت حد تک روایتی فکر ہے۔ ہم نے جدید علوم کی روشنی میں قرآن و حدیث پر اور قرآن و حدیث کی روشنی میں جدید علوم پر غور و فکر کی عادت نہیں ڈالی بلکہ ہمارے مفسرین، محدثین، علماء اور صوفیاء نے اسلامی عقائد کی جو تعبیر کی ہم اسی کو اسلامی فکر سے موسوم کرتے رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اسلام کو اپنے زمانہ کی روشنی میں سمجھا تھا اور ہمیں اسلام کو عہدِ جدید کی روشنی میں سمجھنا ہے۔

دوسرا بنیادی نظریہ جو اس طرزِ فکر کی تہ میں کام کر رہا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام ایک جامد و ساکن اور بنا بنایا (READY-MADE) نظام یا ایک آہنی چوکھٹا (IRON FRAME WORK) ہے جس کو تاریخی ارتقاء کے نتائج و اثرات کا لحاظ کئے بغیر ہر ماحول اور ہر معاشرہ میں نصب کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ تاریخ خود ایک الہٰی قوت ہے جو معاشروں کو بناتی بگاڑتی اور نئے معاشرتی حالات پیدا کرتی ہے تاکہ انسانی عقل و اخلاق کی نئے سرے سے آزمائش کی جا سکے،

یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دَور میں جو معاشرہ پایا جاتا تھا، جس کے اندر اسلام نے اپنی عملی اشکال متعین کیا تھا وہی معاشرہ آج تک موجود اور باقی ہے۔ حالاں کہ انسانی معاشرہ اس درمیان میں کئی دورں سے گزر کر موجودہ شکل میں رونما ہوا ہے۔ اس لئے اسلام کی اصولی تعلیمات کو جو کہ ازلی اور ابدی صداقت کی حامل ہیں، اب جدید معاشرہ کے حالات کے لحاظ سے عملی شکل دینی ہوگی۔ اسلام میں جو چیز واقعی ابدی اور ازلی نوعیت کی ہے وہ اس کی کوئی خاص معاشرتی شکل نہیں بلکہ اس کی اصولی اور مقصدی تعلیمات ہیں جو ہر شعبہ حیات میں انسانی غایات اور انسانی اعمال کی سمت مقرر کرتی ہیں۔ اس کی ایک ٹھوس مثال یہ ہے کہ اسلام نے غریب پڑوسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اپنے پڑوسی کو بھوکا نہ رہنے دو۔ یہ تعلیم اپنی اسپرٹ کے لحاظ سے آج بھی قابلِ عمل ہے مگر اس شکل میں نہیں، جس شکل میں کہ دورِ رسالت یا خلافتِ راشدہ کے عہد میں اس پر عمل کیا گیا تھا۔ اُس وقت تک معاشرہ میں امیر و غریب مل جل کر رہتے تھے لیکن آج کل حالت یہ ہوگئی ہے کہ امیر اور خوشحال لوگ شہر کے جن علاقوں میں بستے ہیں، وہاں اُن کے قریب کسی غریب آدمی کا مکان نہیں ہوتا، غریبوں کی بستیاں اور محلے تک اب بالکل الگ ہوگئے ہیں۔ اب اگر کوئی امیر آدمی اپنے پڑوسی کو روٹی دینا چاہے تو یہ ایک حماقت ہوگی کیوں کہ اس کا پڑوسی خود اسی کی طرح خوش حال ہے۔ اگر اُسے کسی غریب کی مدد کرنی ہے تو اُس کو اپنا محلہ چھوڑ کر دوسرے محلہ میں بسنا ہوگا۔ جہاں غریب لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانات میں رہتے ہوں مگر شاید کوئی بڑے سے بڑا متقی امیر بھی اس پر آمادہ نہ ہو کہ وہ تنگ گلیوں اور عفونت آمیز مکانات کے سایہ میں زندگی گزارے اور غریبوں کے پڑوس میں جا بسے۔ لہٰذا اب پڑوسی کا مفہوم اور کھانا کھلانے کا مفہوم وہ نہیں ہوسکتا جو اوائل اسلام میں تھا۔ آج کے زمانہ میں یہ کوئی ثواب کی بات نہ ہوگی کہ ہم کسی غریب آدمی کو ایک وقت کا کھانا کھلا دیں کیوں کہ اس سے اس کی معاشی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ کھانا کھلانے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنی بستی میں کسی شخص کو محتاج اور فلاکت زدہ نہ رہنے دیں۔ اسی طرح پڑوسی صرف وہی شخص نہیں۔ جو واقعی ہمارے پڑوس میں رہتا ہو بلکہ ہماری قوم کا ہر فرد اس زمانہ میں ہمارا پڑوسی ہے۔ اس کی امداد و اعانت اور حاجت روائی ہمارا فرض ہے۔ اس لئے پڑوسیوں کی امداد کی عملی شکل یہ ہوگی کہ ہم مزدوروں کو معقول اُجرت دلوائیں جس سے اُن کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں اور اس امر کا اہتمام کریں کہ کوئی کارخانہ دار مزدور طبقہ کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ غریب طلبا کے لئے

مفت تعلیم کا انتظام کریں، بیماروں کے لئے مفت طبی امداد کے وسائل بہم پہنچائیں اور یہ تمام کام اجتماعی حیثیت سے سرانجام دیں۔ اس کے بجائے اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ چند غریب آدمیوں کو کھانا کھلا کر ہم نے اسلام کی تعلیم پر عمل کر لیا اور خدا کے سامنے سرخرو ہو گئے تو یہ ہماری انتہائی نادانی ہو گی۔

سود کی ممانعت کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ جن علل و مصالح کی بنا پر سود کو ممنوع قرار دیا گیا تھا، وہی علل و مصالح اب اس امر کی مقتضی ہیں کہ معاشی لین دین اور کاروبار کی کچھ اور صورتوں کو بھی ممنوع قرار دیا جائے۔ بات یہ تھی کہ ایامِ جاہلیت میں دولت مند لوگ غریبوں کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ جب ان غریبوں کو قرض کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ انہیں اس شرط پر قرض دیتے تھے کہ اگر سال بھر کے بعد وہ اس کی ادائیگی سے قاصر رہے تو انہیں دوگنی رقم دینی ہو گی۔ پھر دو سال گزر جانے کے بعد وہ چوگنی رقم وصول کر لیتے اور اگر اس مدت کے بعد بھی قرض دار اس رقم کی ادائیگی سے معذور رہتا تو وہ اسی نسبت سے شرح سود بڑھاتے رہتے، اسلام نے اس طریقہ کو ممنوع قرار دیا۔ اب موجودہ زمانہ میں دولت مند افراد لوگوں کی معاشی مجبوریوں سے دوسرے طریقوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ اپنے پیسہ سے مکانات تعمیر کرتے ہیں اور انہیں کرایہ پر دیتے ہیں۔ اصولاً انہیں مکان سے صرف اتنا کرایہ وصول کرنا چاہیئے جتنا مکان کی تعمیر پر ان کا سرمایہ لگا ہے یا کچھ زائد۔ لیکن مالکان مکان یہ دیکھ کر کہ شہر میں مکانات کی قلت ہے اور لوگوں کو سر چھپانے کے لئے مکانات کی شدید ضرورت ہے دوگنا سہ گنا بلکہ کئی گنا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ یہ وہی صورت ہے جس کے باعث سود کو ممنوع قرار دیا گیا تھا کیونکہ یہاں بھی ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی معاشی مجبوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرتا ہے۔ مگر اس قسم کے ظالمانہ کاروبار کو کوئی مسلمان ممنوع نہیں سمجھتا۔ یا ایک اور مثال لیجئے۔ دولت مند تاجر اشیاء خوردنی مثلاً آٹے یا چاول کی قیمت بڑھانے کے لئے مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے بہرحال آٹا یا چاول خریدنا پڑے گا خواہ اُن کی دیگر ضروریات پوری ہوں یا نہ ہوں۔ اس طرح وہ غریب افراد کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر خود تو زائد منافع حاصل کر لیتے ہیں لیکن ہزاروں لاکھوں انسانوں کو معاشی مصائب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ چیز سود سے قبیح تر نہیں۔ کیا اس میں بمقابلہ سود کے معاشی ظلم زیادہ نہیں

ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ مسلمان سود کے حرام ہونے پر تو اس قدر مُصر ہے لیکن اس منافع اندوزی اور استحصال کو مذہباً ناجائز نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشی ظلم و ستم اور استحصال ناجائز کی اشکال اب وہ نہیں ہیں جو زمانہ اسلام میں تھیں۔ لہٰذا اگر اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنا ہے تو ہمیں موجودہ معاشرہ کو مدِ نظر رکھنا ہوگا نہ کہ اوائل اسلام کے معاشرہ کو۔

اب اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے بارے میں اسلام کا کیا موقف ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام اسلامی نہیں ہے کیوں کہ اوائل اسلام کا معاشی نظام اس سے بہت مختلف تھا۔ جس زمانہ میں رسول اللہ صلعم نے اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی اس وقت عرب میں مزدور اور سرمایہ دار کے نزاع کا کوئی امکان نہ تھا۔ بڑے پیمانہ کی صنعت و حرفت جس پر آج کل کا معاشی نظام قائم ہے اس زمانہ میں ناپید تھی، نہ وہاں کارخانے تھے نہ فیکٹریاں، نہ دست کاری اور نہ صنعت۔ البتہ مکہ کے لوگ تجارتی کاروبار کرتے تھے لیکن انہیں سرمایہ دار نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ سرمایہ دار کا لفظ جدید معاشی اصطلاح میں صرف اس شخص یا طبقہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو اپنی معاشی قوت سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی محنت سے فائدہ اٹھا سکے۔ لیکن اوائل اسلام میں کسی دولت مند کی معاشی قوت اتنی بے پناہ نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگوں کے پاس غلام تھے اور یہی وہ طبقہ تھا جس سے لوگ استحصال کر سکتے تھے۔ لیکن غلامی کے نظام کو سرمایہ دارانہ نظام نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ غلاموں کی تعداد عرب میں بہت محدود تھی۔ اوائل اسلام کی تاریخ میں کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں ملتا جس کے پاس ہزار دو ہزار غلام ہوں۔ پھر ان غلاموں سے بھی زیادہ تر خانگی کام لیا جاتا تھا۔ اور انہیں جلب زر یا حصولِ منفعت کا آلہ کار نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اس زمانہ میں جاگیرداری یا زمینداری کا نظام بھی موجود نہ تھا۔ اوّل تو عرب میں کاشت ہی کم ہوتی تھی۔ مدینہ اور طائف میں جہاں کی زمینیں قابل کاشت تھیں کوئی ایسا طبقہ موجود نہ تھا جسے ہم جاگیرداروں یا زمینداروں کی صف میں لا سکیں۔ اس لئے اوائل اسلام کے دَور کو جاگیرداری یا سرمایہ داری کا دَور نہیں کہا جا سکتا اور نہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اسلام لازماً سرمایہ داری کی حمایت یا مخالفت کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے نام پر سوشلزم کی مخالفت یا حمایت بھی صحیح نہیں۔ کیوں کہ یہ نظام بھی اوائل اسلام میں موجود نہ تھا اور اسلام نے اس کے بارے میں کچھ

نہیں کہا ۔ درحقیقت ہمیں ان مسائل کو اپنی صوابدید اپنے حالات اور عصری تقاضوں کے لحاظ سے حل کرنا ہوگا ۔ البتہ ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کی بنیادی اور اصولی تعلیمات کیا ہیں ۔ ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ کیا اسلام میں معاشی عدل کا تقاضا پایا جاتا ہے اور اگر پایا جاتا ہے تو اسے زمانہ رسالت میں کس طرح بروئے کار لایا گیا تھا اور موجودہ زمانہ میں کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے ۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اسلامی تعلیمات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل وانصاف کے اصولوں پر بڑی شد و مد سے اصرار کیا ہے ۔ قرآن میں عدل وقسط کی تاکید جتنی کثرت سے کی گئی ہے ۔ اس کی مثال کسی اور الہامی کتاب میں نہیں ملتی ۔ مثلاً قرآن ہدایت کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تنازعات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے :۔

ان اللہ یامرکم ان تودّوا الامانات الی اھلھا واذ حکمتم بین الناس ان تحکمو بالعدل (سورۃ نساء ۔ ۵۷)

اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں لڑ بیٹھیں تو حکم دیا گیا ہے کہ اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دی جائے :۔

ان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احداھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیّٰ تفئ الیٰ امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل (الحجرات ۔ ۸)

یتامیٰ کے بارے میں انصاف کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر انہیں یہ ڈر ہو کہ تم اُن کے ساتھ انصاف کر سکو گے تو دو' تین' یا چار عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو ۔

وان خفتم الاّ تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع (سورۃ نساء ۔ ۲)

پھر یہ کہا گیا ہے کہ اگر ایک سے زائد بیویوں سے انصاف نہ کر سکو تو صرف ایک بیوی پر قناعت کرو

فان خفتم الاّ تعدلوا فواحدۃً (سورۃ نساء ۔ ۲)

اپنے نفس اپنے ماں باپ اپنے رشتہ داروں اور غریب وامیر کے مقابلہ میں یکساں انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔

یا ایّھا الذین آمنو کونوا قوّامین بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین

ان یکن غنیاً او فقیراً فاللہ اولیٰ بھما فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا (سورۃ نساء - ۱۳۴)

یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ کسی گروہ یا جماعت کے ساتھ اگر تمہاری دشمنی ہو تب بھی اُس کے ساتھ ناانصافی نہ کرو۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوّامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ (مائدہ - ۷)

بات کرتے وقت بھی انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے خواہ اس سے رشتہ داروں کا مفاد متاثر ہو جائے :

واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ۔ (الانعام - ۱۵۱)

ناپ تول میں بھی انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے :-

ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتیٰ یبلغ اشدہ واوفوا الکیل والمیزان بالقسط (الانعام - ۱۵۱)

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسولوں کا مشن ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کریں :-

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید - ۲۴)

اور پھر عام طریقہ پر عدل و احسان کے اصولوں پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے :-

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاءِ ذی القربیٰ (سورۃ النحل - ۸۹)

ان تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں عدل کے قیام کا مقتضی ہے۔ وہ مرد و زن کے تعلقات کو انصاف پر مبنی دیکھنا چاہتا ہے۔ یتامیٰ کے حقوق کی نگرانی کرتا ہے تاکہ ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہو سکے، ایک ہی قوم و ملت کے مختلف گروہوں کے تعلقات عدل کے اصول پر منضبط کرنا چاہتا ہے اور متصادم اور متنازع گروہوں کے مابین بھی انصاف کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کیا جا سکے۔ جس مذہب کو انصاف اور معدلت پر اتنا اصرار ہو، وہ معاشی عدل کے تقاضے سے کیسے گریز کر سکتا ہے اور اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے

کہ سوسائٹی میں صرف ایک محدود طبقہ دولت کی فراوانی سے مستفید ہو، اور عوام الناس کی عظیم اکثریت فقر و افلاس کی زندگی گزارے۔ یقیناً یہ چیز انصاف کے خلاف ہے اور اس سے وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جس کے لئے قرآن کے ارشاد کے مطابق انبیاء علیہ السلام کی بعثت عمل میں آئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس قسم کی غیر منصفانہ معیشت کو نہ صرف ناپسند کرتا ہے بلکہ اس نے اپنی معاشی تعلیمات کی جو عملی شکلیں تجویز کی تھیں ان کے باعث وہ اپنے زمانہ میں ایک اعلیٰ درجہ کی عادلانہ معیشت قائم کرنے میں کامیاب بھی رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ معاشی تعلیمات کیا تھیں اور انہیں عملاً کس طرح نافذ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ اسلام دولت کی گردش کو محدود رکھنا نہیں چاہتا ہے۔ قرآن نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اجتماعی دولت کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ اس سے صرف مالدار طبقہ ہی نہیں بلکہ تمام طبقات یکساں طور پر مستفید ہوں:۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔

(جو کچھ اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے، اس میں اللہ اور اُس کے رسول کا حصہ ہے اور رسول کے رشتہ داروں کا حصہ ہے اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا تاکہ یہ آمدنی صرف مالداروں کا حصہ بن کر نہ رہ جائے) (سورہ حشر۔ ۶)

اس اصولی اور مقصدی تعلیم کو عملی شکل دینے کے لئے قرآن انفاق فی سبیل اللہ کی نہایت شد و مد سے تاکید کرتا ہے۔ جس طرح آج کل کے زمانہ میں قرآنی تعلیم کے بالکل برعکس نظام سرمایہ داری روپیہ بچانے کی تعلیم و تلقین کرتا ہے۔ قرآن میں انفاق یعنی رفاہی کاموں پر روپیہ خرچ کرنے پر اتنا ہی اصرار کیا گیا ہے جتنا نماز۔ روزہ یا ادائیگی زکوٰۃ پر۔ اس کی وجہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن جن تاریخی اور معاشرتی حالات میں نازل ہوا اُن کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس زمانہ تک اسلامی حکومت کے پاس کوئی باقاعدہ نظم و نسق نہیں تھا۔ اسلامی نظم و نسق کی ابتدا حضرت عمر کے زمانہ سے ہوئی، جب بعض صحابہ کے مشورہ پر حضرت عمر نے ایرانی طرز کا دیوان قائم کیا۔ اس طرح

اسلامی عہد میں پہلی مرتبہ دفتری نظام کا آغاز ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس حکومت کا دفتری نظام اتنی ابتدائی حالت میں ہو، وہ حکومتی سطح پر اجتماعی فلاح و بہبود کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ مدارس قائم کرے، ہسپتال کھولے یا بے روزگاری کی حالت میں لوگوں کی امداد کر سکے۔ ایسی صورت میں صاحبِ استطاعت افراد کو اس امر کا ذمہ دار بنایا گیا کہ وہ جہاں کہیں غربت و فلاکت یا بدحالی پائیں، اپنے انفرادی وسائل سے کام لے کر مستحق لوگوں کی امداد کریں۔ لیکن آج کل کے حالات میں فرداً فرداً اس نوعیت کی معاشی امداد سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا ہے جس کے لئے اسلام نے انفاق کی تاکید کی تھی۔ اب اس کام کو اجتماعی سطح پر کرنا ہوگا۔ خواہ دولت مند لوگ باہمی تعاون کے ذریعہ رفاہی ادارے قائم کریں یا حکومت اس کام کو اپنے ذمہ لے لے۔ مگر چوں کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت انفاق کی اسپرٹ سے خالی ہے اور سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لوگ اپنی دولت بچا بچا کر مزید دولت پیدا کرتے رہیں۔ اس لئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ دولت مند افراد خود آگے بڑھ کر ایسے رفاہی یا تعلیمی ادارے قائم کریں گے، جن سے نچلے طبقات کو معاشی میدان میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔ ایسی صورت میں رفاہی کاموں کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔

لیکن اسلام نے معاشرہ سے معاشی فلاکت کے ارتفاع و استیصال کے لئے صرف انفاق کی تعلیم پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ زکوٰۃ کی صورت میں مسلمانوں پر ایک واجبی ٹیکس بھی لگایا۔ جو لوگ زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، انہیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ زکوٰۃ کا وجوبی عنصر (OBLIGATORINESS) اسے ٹیکس سے قریب تر لے آتا ہے۔ اگر زکوٰۃ کی وجوبیت کو ختم کر دیا جائے تو اُس میں اور انفاق کی دوسری صورتوں مثلاً صدقات اور خیرات میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بہر حال اس بحث سے قطعِ نظر کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے یا عبادت، اسلام نے زکوٰۃ کے جو مصارف مقرر کئے تھے، ان میں رفاہِ عامّہ کے نقطہ نظر سے چند مصارف بے حد اہم ہیں:۔

اوّلاً : الفقراء و المساکین (فقراء اور مساکین)

دوم : فی الرقاب (غلاموں کو آزاد کرانا)

سوئم : والغارمین (قرض داروں کے قرضہ کی ادائیگی)

چہارم: وابن السبیل (مسافروں کی اعانت) (سورۃ توبہ - ٦٥)

زمانہ اسلام میں بھی چار طبقات یعنی فقرار، مساکین، قرض دار اشخاص اور مسافر معاشی امداد کے سب سے زیادہ مستحق قرار دیئے گئے۔ اور ان کی امداد کے لئے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں عدلِ معاشی کے تقاضے کی تکمیل کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی گئی تھیں۔ اور معاشرہ کے جو لوگ معاشی اعتبار سے پس ماندہ رہ جاتے تھے انہیں آزاد مسابقت (FREE COMPETITION) کے بے رحمانہ اصول پر قربان نہیں کیا جاتا تھا۔ ہم نے آزاد مسابقت کے اصول کو بے رحمانہ اس لئے قرار دیا ہے کہ آزاد مسابقت کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے معاشی عدل پیدا کیا جائے۔ معاشی عدل کے بغیر آزاد مسابقت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دو آدمیوں میں سے اگر ایک دولت کی غلط تقسیم اور تعلیمی مواقع سے محروم رہ جانے کے باعث جاہل رہ گیا ہو، اور دوسرا تعلیم یافتہ ہو تو اول الذکر دوسرے کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں ابھی قوت سے فعل میں نہیں آئی ہیں۔ آزاد مسابقت درحقیقت انہیں افراد و طبقات کے درمیان ہو سکتی ہے، جو معاشی حیثیت سے کم از کم اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہوں اور جن کو یکساں تعلیمی اور تہذیبی مواقع حاصل ہوں۔ جس طبقہ کے افراد فاقہ کشی میں مبتلا ہوں یا فاقہ کشی کی سطح سے قریب تر آ چکے ہوں جن کو معاشی بدحالی کے باعث کسی قسم کا ذہنی سکون حاصل نہ ہو، جو خود تعلیم و تہذیب سے بے بہرہ ہوں اور جن میں اتنی معاشی استطاعت بھی نہ ہو کہ وہ اپنی اولاد کو اعلےٰ یا متوسط درجہ کی تعلیم دلوا سکیں ان کے درمیان اور دولت مند و خوش حال طبقات کے درمیان آزاد مسابقت کیسے ممکن ہے۔

مستحقین زکوٰۃ کے مذکورہ بالا چار طبقوں میں سے مسافروں اور غلاموں کے دو طبقات معدوم ہو چکے ہیں۔ اس زمانہ میں کوئی مسافر محض مسافر ہونے کی بنا پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ معاشی امداد کا مستحق ہے۔ کیوں کہ مسافرت کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اس زمانہ کی مسافرت میں انسان کو وہ پریشانیاں درپیش نہیں ہوتیں، جن سے زمانہ اسلام میں مسافروں کو سابقہ پڑتا تھا۔ اسی طرح انسدادِ غلامی کے باعث اب غلاموں کا وہ طبقہ بھی باقی نہیں ہے۔ جس کی امداد و اعانت کے لئے زکوٰۃ صرف کی جاتی تھی۔ یہ اور بات

ہے کہ ہم مزدوروں کو غلاموں کے درجہ پر رکھ کر انہیں مستحق زکوٰۃ قرار دیں، کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مزدوروں کی جو حالت ہے، وہ غلاموں سے کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور رکھتی ہے۔ بہر حال مستحقینِ زکوٰۃ کے اب صرف دو طبقے باقی ہیں:۔ (۱) فقراء و مساکین (۲) غارمین (قرضدار لوگ)۔ فقراء اور مساکین کی تعریف میں ملک کی وہ ساری آبادی آجاتی ہے۔ جو اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے اور اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت، نیز اپنے اہل خاندان کی طبی امداد کا انتظام نہیں کر سکتی۔ قرضدار اب بھی موجود ہیں لیکن قرضداروں کو امداد دینے سے غالباً اسلام کا منشا یہ نہ تھا کہ ہر مقروض کو بلالحاظ حالات مستحق زکوٰۃ قرار دیا جائے۔ صرف ایسے ہی قرض داروں کو امداد دی جاتی ہوگی جو قرضہ کی ادائیگی کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ ورنہ اگر ہر مقروض کو مستحق امداد قرار دیا جائے تو لوگ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر غیر ضروری مصارف پر اپنا روپیہ پیسہ صرف کرنا شروع کر دیں گے۔ آج کل قرضداروں کے طبقہ میں سب سے زیادہ لائقِ توجہ طبقہ ان کسانوں کا ہے جو اپنے زرعی کاروبار کے لئے قرضہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ واقعی مستحق امداد ہیں، اور انہیں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ زمانہ میں زکوٰۃ کی صورت وہی ہوگی جو زمانہ اسلام میں تھی۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام کی ابدیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے مقاصد و غایات اور اس کے اقدار ابدی ہیں۔ لیکن ان مقاصد اور اقدار کے حصول کے لئے کسی خاص زمانہ میں جو عملی طریقے اور تدابیر اختیار کی گئی تھیں، ضروری نہیں کہ وہ بھی ابدی ہوں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو زکوٰۃ کی شکل بھی اقتضائے حالات کے تحت بدل سکتی ہے اور اس کی شرح میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اصل میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اسلام زکوٰۃ عائد کر کے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ کے ذریعہ ایک طرف تو اسٹیٹ اپنے دفاعی اخراجات کی تکمیل کرتی تھی اور دوسری طرف ان افراد و طبقات کی معاشی امداد کرتی تھی جن کو وہ مستحق زکوٰۃ قرار دیتی تھی۔ اس طرح زکوٰۃ فقراء، و مساکین اور غارمین (قرض داروں) کی معاشی اعانت کے علاوہ فی سبیل اللہ یعنی مصارف جہاد کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں حکومتیں دوسرے ٹیکسوں کے ذریعہ اپنے دفاعی اخراجات کی تکمیل کرتی ہیں۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ اس طریقہ کو مسدود کر کے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، پھر سے زکوٰۃ کو اس مصرف میں لگایا جائے، جب کہ زکوٰۃ

کی آمدنی دفاعی اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ عہد اسلام میں حکومت کے دفاعی اخراجات محدود تھے مگر آج کل دفاع پر اربوں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ یہ روپیہ صرف زکوٰۃ کی مد سے وصول کیا جائے گا، تو زکوٰۃ کی ساری رقم صرف ہو جائے گی اور پھر بھی دفاعی مصارف کی تکمیل نہ ہو گی۔

زکوٰۃ کا دوسرا اہم مصرف یہ تھا کہ اس کے ذریعہ فقراء، مساکین اور غارمین کی امداد کی جاتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں رفاہی خدمات پر حکومتیں جو روپیہ صرف کرتی ہیں، اس سے ایک حد تک زکوٰۃ کا یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن رفاہی کاموں کا دائرہ اکثر ممالک میں ابھی تک بہت محدود ہے۔ مشرقی ممالک میں حکومت زیادہ سے زیادہ جو رفاہی خدمات انجام دیتی ہے، وہ تعلیم اور طبّی امداد تک محدود ہے۔ لیکن دنیا کی ترقی یافتہ اور بالخصوص سوشلسٹ ممالک میں رفاہی خدمات کا تصوّر اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس میں مفت تعلیم اور مفت طبّی امداد کے علاوہ بے روزگاری کا بیمہ، بیواؤں اور سن رسیدہ افراد کے وظائف بھی شامل ہیں۔ اس لئے اگر مسلمان حکومتیں اپنی رفاہی خدمات کا دائرہ وسیع کر کے یہ تمام ذمہ داریاں قبول کر لیں تو وہ درحقیقت زکوٰۃ کے مقاصد کو پورا کر دیں گی۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اسٹیٹ اُس بات کی دستوری ضمانت (CONSTITU-TIONAL GUARANTEE) دے کہ وہ اپنے بجٹ کا ایک متعین حصہ ان رفاہی خدمات پر صرف کرے گی اور مفت تعلیم اور مفت طبّی امداد کے علاوہ بیواؤں اور سن رسیدہ اشخاص کے لئے وظائف مقرر کرے گی نیز بیکاری کی صورت میں بے روزگار افراد کو معقول معاشی امداد دے گی اور اپاہجوں اور معذوروں کے لئے ایسے ادارے قائم کرے گی جہاں وہ اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں، بلکہ اگر ممکن ہو تو کوئی کام سیکھ کر اپنا روزگار تلاش کر سکیں۔ یہ دستوری ضمانت اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ صورت میں حکومتیں اپنی صوابدید سے جتنی رقم چاہتی ہیں، رفاہی خدمات پر صرف کرتی ہیں۔ اگر حکومتوں کا رجحان معاشرتی عدل کی طرف ہوتا ہے تب تو رفاہی خدمات کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو تو رفاہی کاموں کا شعبہ محدود اور تنگ تر ہو جاتا ہے اور عوام کے مفاد کے کاموں سے حکومت کو بہت کم دلچسپی رہ جاتی ہے۔ ان حالات میں مقاصد زکوٰۃ کی تکمیل کے لئے دستوری ضمانت کا موجود ہونا ضروری ہے۔

بہرحال کیمونزم اور دیگر غیر اسلامی تصورات سے معاشرہ کو اسی صورت میں محفوظ رکھنا ممکن ہے جب مقاصد

زکوٰۃ کی تکمیل کے لئے کچھ نئی شکلیں پیدا کی جائیں ۔ ورنہ ہمارا موجودہ نظامِ معیشت اُبھرتی ہوئی لادینی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ کیوں کہ یہ خود لادینیت پر مبنی ہے ۔ اس نظامِ معیشت کو اسلامی قرار دینا اسلام کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی ہے ۔

"اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کیا کہ ملت و دین کی کجی کو دُور کیا جائے اور ایک ایسی امت اور قوم تیار کی جائے ، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری قوت سے انجام دے اور لوگوں کی فاسد رسوم کو یکسر تبدیل کر دے تو یہ امر اس بات پر موقوف تھا کہ ان ہر دو سلطنتوں کو دنیا سے نیست و نابود کر دیا جاتا اور اس مقصد کو سہولت و آسانی سے حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان ہر دو جابر سلطنتوں سے تعرض کیا جاتا ۔ کیوں کہ انہی دو سلطنتوں کے حالات تمام متمدن اور صالح ممالک میں سرایت کئے ہوئے تھے ، یا سرایت کرتے چلے جاتے تھے ، پس اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو سلطنتوں کے زوال اور قلع قمع کا فیصلہ کر لیا اور خود آنحضرت صلعم نے اس کی خبر دی کہ ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ و ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ اور حق اس طور پر نازل ہوا کہ روئے زمین سے باطل کی جڑیں اس طریقے سے اُکھاڑ دی گئیں ۔ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کر دیا گیا اور پھر عرب کے ذریعہ ان ہر دو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کر دیا گیا ۔ تمام عالم کی باطل طاقتیں توڑ دی گئیں اور دنیا سے باطل کا خاتمہ کر دیا گیا ۔

ان دو زبردست شہنشاہوں (کسریٰ اور قیصر) کی دولت و طاقت کو توڑ دینا اور اُن کے ملک پر تسلط و اقتدار قائم کر لینا ایسا تھا گویا تمام روئے زمین پر تسلط و اقتدار قائم کر لیا گیا ۔ ان سلاطین کی غیر معتدل مرفہ الحالی اور مفرطانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات و اطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کر چکی تھیں ، جو ان کے تسلط و اقتدار کے زیرِ فرمان تھے ، اور تمام باشندے ان کے رنگ میں رنگ چکے تھے اور اس لئے ان کی عادات و اطوار اور رسوم و رواجات کو تبدیل کر دینا اور اُن کو ان خطرناک جراثیم سے پاک صاف کر دینا گویا دنیا کے تمام ممالک کی اصلاح و درستگی تھی ۔"

(اُردو ترجمہ ، حجۃ اللہ البالغہ از حضرت شاہ ولی اللہؒ)